بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا
(غالبؔ)

ISBN: 978 969 743 0376

زیرِ مطالعہ کتاب صدیق صائبؔ کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور متن کی تمام تر ذمہ داری انہی کو متحسن ہے۔ ادارہ اردو سخن ڈاٹ کام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔ (ادارہ)

اردو شعری مجموعہ

سرِ خواب

صدّیق صائبؔ

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094

اسٹاکسٹ: ادارہ فکر و دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

سرِخواب

صدّیق صائبؔ
مسلم ٹاؤن، ہنڑپورہ۔سیالکوٹ (پنجاب۔پاکستان)
رابطہ فون:03006136346

استحقاق: تمام تصرفات ''صدّیق صائب'' کی تحویل میں ہیں
ناشران: اردو سخن پاکستان (چوک اعظم)/سلام اُردو پاکستان (سیالکوٹ)
نمودِ اول: اپریل 2021ء

اہتمام: ڈاکٹر شیراز مسعود ہاشمی
کمپوزنگ: محمد شہریار ناصر
سرورق: ناصر ملک
طباعت: شیرِ ربانی پریس، ملتان
قیمت: 450 روپے (30 یورو، 40 ڈالر)

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094
اسٹاکسٹ: ادارہ فکر و دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

انتساب

والدہ محترمہ کے نام!

جو میرا خواب ہیں

والدِ محترم اور برادرِ مکرّم کے نام!

جن کے لطف و عطا اور مہر و وفا کی یادیں میری

زندگی کا سنہری باب ہیں

اہلیہ اور بچوں کے نام!

جو میری کائنات ہیں

تعارف مصنف

نام: حافظ محمد صدیق قادری

قلمی نام: صدّیق صائبؔ

تعلیم: ایم۔فل (اسلامی فکر و تہذیب)

ایم۔اے (اسلامیات)

ایم۔اے (اردو)۔بی۔ایڈ، فاضل عربی

پیشہ: تدریس و خطابت

ملازمت: استاد شعبہ اردو (پنجاب دانش سینٹر آف ایکسی لینس)

گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول سیالکوٹ۔ پاکستان

ایڈریس: قادری سٹریٹ۔نزد جامع مسجد برکات عائشہ صدیقہ

محلہ مسلم ٹاؤن ہنٹر پورہ ڈاکخانہ کینٹ۔سیالکوٹ (پاکستان)

رابطہ فون نمبر: 03006136346

سرِخواب

ہر آنکھ کسی خواب کے قابل نہیں ہوتی
ہر خواب کسی نیند کا حاصل نہیں ہوتا
اک لمحہء بیدار اترتا ہے سرِخواب
مدت سے مرا خواب مکمّل نہیں ہوتا

فہرست

جہانِ خیال:

صدّیق صائبؔ کا شعری منظر نامہ — حسن عباس رضاؔ — 12

صدّیق صائبؔ اور "سرِخواب" — ضیاء المصطفیٰ تُرک — 14

سرِخواب؛ ایک جائزہ — علی عمرؔان — 19

ہم صورت گر کچھ خوابوں کے — صدّیق صائبؔ — 24

حمد:

ہیں نقش دوامی ترے قرآن کے پارے — 29

نعت:

ترے دیار کا سودا ہے سر میں رکھا ہوا — 31

سلام:

یہی حوالہ ہی سب سے بڑا حوالہ ہے — 33

جہانِ غزل:

ناؤ اس کی ہے جہاں چاہے اتارے مجھ کو 35

اس قدر خوبیٔ تقدیر نہیں ہو سکتی 37

نہیں کہ دل میں کوئی آرزو نہیں مرے دوست 39

گرتی دیوار کو یا ٹوٹتے دَر کو دیکھوں 41

ہم تری کلّی اطاعت بھی نہیں کر سکتے 43

ڈوبتی ناؤ کو اک موج کنارہ دے گی 45

موت سے جیتا ہوا زیست سے ہارا ہوا شخص 47

یہ جو دوری ہے یہ تسخیر بھی ہو سکتی ہے 49

میں تری ذات سے انکار نہیں کر سکتا 51

سفر کا علم ہے سمتِ سفر نہیں معلوم 53

کبھی نفرت تو کبھی پیار میں گم رہتا ہوں 55

کمال تھا کوئی اس کی نظر میں رکھا ہوا 57

اے دل درِ یقیں پہ رسائی کا وقت ہے 59

دنیا بہت ہے تیز مرے یار دیکھ کر 61

ضبط کا امتحاں ضروری ہے 63

تمہارے بعد رہا ہوں میں کتنا سخت اداس 65

اداس روح ہے یوں خاکدان کے اندر 67

میرے یوسف تری تقدیر سے ڈر لگتا ہے 69

کتنا پر پیچ سفر لگتا ہے 71

کوئی آئے بھی اگر دیپ جلانے والا 73

کسی فن میں مرے مولا مجھے کامل کر دے 75

ایسے نکلے ترے گمان سے ہم 77

یاد ہم دشت نوردوں کی نشانی رکھنا 79

غیب سے کوئی اشارہ بھی تو ہو سکتا ہے 81

ہر ایک درد کا عنوان تو نہیں ہوتا 83

تمہارے پاس بھی دنیا میں کیا نہیں دنیا 85

حرف تنویر میں نہیں آتا 87

لوگ کیوں ہم سے جدائی کا سبب پوچھتے ہیں 89

نہیں آئینہ کوئی حیرت کو 91

گرد شت میں جاتے تو پلٹنے کے نہیں تھے 93

وہ جو ممکن نہیں امکان میں ڈھل سکتا ہے 95

رنج ایسا کہ اٹھایا نہیں جاتا مجھ سے 97

تیری روداد کو، بنیاد کو ہم جانتے ہیں 99

جمالِ دشت جلالِ جنوں سے قائم ہے 101

حسرت و مدعا نہیں کوئی 103

جب کبھی اس کے روبرو کی ہے 105

ہم نے کب دشتِ تعصب میں قدم رکھا ہے 107

دیکھیں جو سرِ خواب نظارہ مری آنکھیں 109

جس نے بھی حُسن کا نظارہ کیا 111

مجھ سے مخلص ہے ہم سفر کتنا 113
کوزہ گر مجھ پہ رشک کرتے ہیں 116
یہ نیم جاں کہاں اپنی زباں سے بولتا ہے 117
تم جو چلنے کا حوصلہ رکھتے 118
بگولہ یوں خس و خاشاک سے الجھتا ہے 120
لگتا ہے آ رہی ہے گھڑی امتحان کی 122
تجھ کو ادراک محبت کا اگر ہو جائے 124
میں اپنے فن سے تر ذائقہ بدل لوں گا 126

جہانِ نظم:

آزادی 128
نذرِ اقبال 129
دہشت گرد 130
بساطِ وقت 131

صدّیق صائبؔ کا شعری منظر نامہ

شعری کائنات اس وقدر وسیع ہو چکی ہے کہ اس کی چاروں سمتوں سے صدائے سخن سماعتوں سے ٹکراتی اور سرشار کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح آسمانِ سخن پر بھی شعر کے ان گنت ستارے اپنی روشنی بانٹتے رہتے ہیں۔ کاہکشاں کے اس ہجوم میں کچھ ستارے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی منفرد روشنی دامنِ دل کو کھینچتی ہے اور دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

ہمارے ایک دوست ڈاکٹر شیراز مسعود ہاشمی صاحب کے توسط سے آج ہمیں جناب صدّیق صائبؔ کی کچھ غزلیں اور اشعار پڑھنے کو ملے تو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ شعراء کے ہجوم میں رہ کر بھی منفرد اور خوبصورت شعر کہہ رہے ہیں۔

یہ عشق جاں کا زیاں ہے کہ صرف جی کا زیاں
سو ہم سے پوچھ لو تم کو اگر نہیں معلوم

میری منزل تیری سوچوں سے بہت آگے ہے
راہ دکھلائیں گے کیا تیرے ستارے مجھ کو

صدّیق صائبؔ کی شاعری کا خاص وصف یہ ہے کہ ان کے اشعار میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں

کی لذتیں اور تلخیاں ہم رکاب رہتی ہیں۔

ان کی غزل میں داخل اور خارج کے رجحانات شعری حُسن سے ہم آہنگ ہیں۔صدّیق صائبؔ اپنی شاعری میں جہاں سادگی سے اور عام فہم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں، وہاں ان کی غزل میں تغزل کی چاشنی کے ساتھ ساتھ غنائیت کی لہریں بھی قاری کے دل و دماغ کو چھو کر گزرتی ہیں۔

نہ میری خاک پرانی نہ تیرا چاک نیا
کوزہ گر آ میں تیرے دستِ ہنر کو دیکھوں

ہم کو اجداد کی قبروں سے حیا آتی ہے
تو سمجھتا ہے کہ ہجرت بھی نہیں کر سکتے

صدّیق صائبؔ کی غزل کسی مایوسی اور قنوطیت کا شکار نہیں ہوتی۔

جب بھی تم چاہو مجھے چھوڑ کے جا سکتے ہو
دوستی پاؤں کی زنجیر نہیں ہو سکتی

میں صدّیق صائبؔ کو ان کے شعری مجموعے ''سرِخواب'' کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے دعا گو ہوں کہ ان کے زرخیز ذہن اور قلم سے سخن کی تازہ صبحیں طلوع ہوتی رہیں اور دیارِ ادب کو روشن کرتی رہیں۔

حسن عباس رضاؔ

17 جولائی 2020ء

اسلام آباد

صدّیق صائبؔ اور "سرِخواب"

اردو غزل کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس صنف کا اپنا ایک مزاج ہے، اپنی رسمیات اور اپنے موضوعات ہیں۔ اور اس ضمن میں سامنے آنے والا کوئی بھی تخلیقی تجربہ اس وقت تک صورت پذیر نہیں ہوتا جب تک غزل کہنے والا اپنی موہوبی شعرگوئی کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اپنے ماقبل اور معاصر شعری رویوں کا بخوبی شعور نہ رکھتا ہو، بنا بریں کہ اسی شعور ہی کی بنا پر شاعر اپنے فکر و فن کے لیے صحیح سمت کا تعین کرتا ہے۔ اہلِ علم سے یہ نکتہ ہرگز مخفی نہیں کہ اپنے عہد بہ عہد ارتقا سے گزرتے ہوئے ہمارے ہاں غزل اگرچہ بہت سے تغیر و تبدّل سے گزری ہے اور باوجودیکہ اس نے طرح طرح کے مضامین و موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے لیکن اس نے اس نوع کی کسی تبدیلی کو قبول نہیں کیا جو اس کے اساسی جوہر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام تر بوقلمونی کے باوجود ہمارا سرمایۂ غزل اپنے جوہر کی سطح پر باہم مربوط و مبسوط معلوم ہوتا ہے۔ انتقادی طور پر شعری تعین قدر سے قطع نظر، صدّیق صائبؔ کی زیرِ نظر غزلوں کے مجموعے "سرِخواب" کا مطالعہ کرتے ہوئے ماقبل شعری روایت اور معاصر شعری رو کے مذکورہ بالا شعور کا احساس واضح طور پر موجود اور کارفرما نظر آتا ہے، جو بہت خوش آئند ہے۔ بقول احمد مشتاقؔ:

نئے دیوانوں کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے
ہم بھی ایسے ہی تھے، جب آئے تھے ویرانے میں

صدّیق صائبؔ کا تعلق سیالکوٹ کے ادبی حلقے سے ہے اور میری اس سے ملاقاتیں ہمارے وہیں قیام کے عرصے کے دوران رہیں۔ ۹۰ء کی دہائی کے اواخر میں جب میری فیملی ملتان سے سیالکوٹ شفٹ ہوئی تو شروع میں، میں کافی ڈپریشن میں رہا۔ اس کا ایک سبب جہاں یہ تھا کہ میں اپنی جنم بھومی سے دور ہو گیا تھا، وہیں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ملتان کا ادبی ماحول (جس کا میں اب تک حصہ رہا تھا) اُن دنوں مسلسل ادبی سرگرمیوں سے عبارت ہوا کرتا تھا اور وہاں بڑی باقاعدگی سے ہونے والے مشاعروں کے علاوہ ہفتہ وار تنقیدی نشستوں کا ایک معمول تھا، جبکہ سیالکوٹ میں مجھے نسبتاً، ایک جمود کا احساس ہو رہا تھا جو میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ پھر کوئی ایک آدھ سال گزرا تو ایک روز میری ملاقات شاہد ذکی سے ہوئی جو بعد ازاں، عمدہ شاعری کے لیے باہم مشترک ذوق وشوق کے باعث جلد ہی گہری دوستی میں بدل گئی۔

ذکی ہی کی وساطت سے مجھے سیالکوٹ کے سینئر شعرا و ادبا سے متعارف ہونے اور پھر مقامی سطح پر نئے لکھنے والوں سے آشنا ہونے کا موقع ملا جو عموماً، ذکی کے ادارے ہاؤس آف نالج (House of Knowledge) میں ہونے والی ادبی و شعری نشستوں میں آیا کرتے تھے۔ اس اثناء میں اکثر و بیشتر جن نوجوان شعرا کے ساتھ نشستیں رہیں، ان میں چوبارہ سے تعلق رکھنے والا نوجوان علی زیرکؔ اور بجوات (سیالکوٹ کے نواح میں موجود ایک سرحدی علاقہ) سے تعلق رکھنے والے دو نوجوان رفیقؔ لودھی اور صدیق صائبؔ بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ دراصل ان نوجوانوں میں شعر گوئی کی فطری استعداد کے ساتھ ساتھ مزید سیکھنے کا شوق تو تھا ہی، ایک نیازمندانہ روش بھی تھی اور یہ وہ شے ہے جو فی زمانہ شاذ ہوئی جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ غالباً ۲۰۰۱ء میں کہیں صائبؔ نے پہلے پہل اپنے اشعار سنائے تھے، وگرنہ قبل ازیں وہ شعر کا سامع ہی ہوا کرتا تھا۔ تب سے لے کر مئی ۲۰۰۷ء تک (جب میں بسلسلۂ ملازمت، کیڈٹ کالج حسن ابدال شفٹ ہو

گیا) سیالکوٹ میں اپنے حلقۂ احباب کے جن دوستوں سے میری تواتر سے ملاقاتیں رہیں، ان میں ایک نام اس کا بھی ہے۔ آج، اس مجموعے سے گزرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ اس کی غزلوں میں وقت کے ساتھ ساتھ ایک سلیقہ مندی اسی طرح دَر آئی ہے جیسے فکری اعتبار سے آدمی تبدریج بلوغت کی عمر کو پہنچتا ہے۔ عمومی طور پر شعر گوئی اور بالخصوص صنفِ غزل کے لیے مصرع سازی کے ہنر اور حشو وزوائد سے گریز کو ازبس اہم جانا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان ہر دو حوالوں سے زیرِ نظر کتاب میں عمدہ اشعار انتخاب کیے جا سکتے ہیں:۔

اس کی مرضی ہو تو گرداب کنارہ ٹھہرے
وہ نہ چاہے تو کنارہ بھی بھنور ہو جائے

ابد کی راہ میں حائل ہے یہ جہانِ فنا
بھٹک رہا ہوں ابھی اس جہان کے اندر

جانب قریۂ معلوم سفر ہے میرا
کوئی بستی نہ کوئی دشت پکارے مجھ کو
میں کہ گرداب میں غرقاب ہوا جاتا تھا
پھر اٹھا لائی ہے اک لہر کنارے مجھ کو

نہ مری خاک پرانی نہ ترا چاک نیا
کوزہ گر آ میں ترے دستِ ہنر کو دیکھوں
اب مجھے جان بچانی ہے کہ اجداد کی آن
گہے دستار کو دیکھوں، گہے سر کو دیکھوں

موت سے جیتا ہوا، زیست سے ہارا ہوا شخص
ہائے وہ شخص، وہ حالات کا مارا ہوا شخص

دشتِ دنیا، وہ تری دھوپ کو کیا جانتا ہے
آتشِ عشق کی بھٹی سے گزارا ہوا شخص

یہ عشق جاں کا زیاں ہے کہ صرف جی کا زیاں
سو ہم سے پوچھ لو تم کو اگر نہیں معلوم
یہ شہر وہ ہے، جہاں فرصتِ کلام نہیں
یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں معلوم

وقت رکتی ہوئی سانسوں کا پیامی ہو گا
عمر ڈھلتے ہوئے سورج کا اشارہ دے گی

فی زمانہ، اگرچہ فیس بُک پر روزانہ ڈھیروں ڈھیر غزلیں پوسٹ کرنے والوں کا ایک جمِ غفیر موجود ہے اور اس میں ہر درجے اور ہر معیار کے اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ بیشتر "کاتا اور لے دوڑی" کا منظر ہی دیکھنے میں آتا ہے، ایسے میں اس قبیل کے لکھنے والے غنیمت ہیں جو شعر کہنے کے بعد قدرے تامل کرنے اور اس پر غور و فکر کرنے کے قائل ہیں۔ میری رائے میں زیرِ نظر مجموعے میں جہاں تضاد اور Contrast سے مضمونِ شعر کی برآمدگی کا عمل نظر آتا ہے، وہیں تلازمے کی سطح پر خلافِ معمول مضمون کی دریافت کی مثالوں کے ساتھ ساتھ روایتِ غزل کی کلاسیک سے خاص سمجھی جانے والی رسمیات و لفظیات کے استعمال کا قرینہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ صائبؔ کے ہاں موجود مصرع سازی، بُنت اور Treatment بیش از بیش جگہوں پر بہت عمدہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان غزلوں میں جہاں کہیں فکری ندرت و تازگی کی مثالیں ملتی ہیں، ان سے

یقینی طور پر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اگر تخلیقی طور پر وہ اسی طرح منہمک و سرگرم رہا تو کچھ عجب نہیں کہ اس کا نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے کہیں زیادہ دلکش اور وقیع تر صورت میں سامنے آئے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمیں باد!

ضیاء المصطفیٰ تُرکؔ

نیم شب، ۲۸ فروری ۲۰۲۱ء

بی۔ ۲۸، کیڈٹ کالج حسن ابدال

سرِخواب---ایک جائزہ

سیالکوٹ کی سرزمین اقبالؔ اور فیضؔ کی شعری روایت کی امین ہے جس کی ادبی فضا پر ان دو شاعروں کی گہری چھاپ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال جیسے اتنے بڑے اور گھنے برگد کے نیچے سے چوٹی فیضؔ نے نکالی ہے تو یہ ان کی فنی پختگی اور شعری ریاضت کا ثبوت ہے۔

ہر عہد میں نئے شعرا ردو قبولیت کے بھنور میں پھنستے آئے ہیں۔ جن شعرا نے محنت، لگن اور ریاضت کا دامن تھام لیا، وہ تمام طغیانیوں کے باوجود کنارے لگے مگر ایسے شعرا جو صرف دھڑے بازیوں، چاپلوسیوں اور سرقہ بازیوں میں مگن رہے تو زمانے کے بے رحم تھپیڑوں نے ان کی شناخت ہی مٹا دی۔

شاعروں کی بھرمار کے اس دور میں شاعری محض الفاظ کا ہیر پھیر، ساحری، پرکاری اور اداکاری بن چکی ہے۔ شعر فقط دو مصرعے موزوں کرنے کا نام نہیں بلکہ فکر و فن کے دو جہاں مجتمع کرنے کا ہنر ہے مگر افسوس کہ اس ہنرمندی کی جگہ شہرت اور مقبولیت نے لے لی ہے۔

اب حال یہ ہے کہ کسی شاعر کے فکر و فن سے ماورا اس کی قامت کا اندازہ بیرونِ ملک پڑھے جانے والے مشاعرے ہیں۔ سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والے بازاری اور سطحی اشعار ہیں۔ ہر گلی محلے میں بننے والی ڈیڑھ اینٹ کی ادبی تنظیمیں ہیں جہاں فکر و خیال سے قطع نظر قافیہ پیمائی اور شعری

ریاضت سے زیادہ حُسن آرائی معیارِ شعر ہوں وہاں اکثر شعرا کی زندگی بھر کا حاصل ایک شعر بھی نہیں ہوتا جو انہیں بعد از حیات زندہ رکھ سکے۔

اردو شاعری کا دامن ایسے شعرا سے بھی مالا مال ہے کہ جن کی شاعری جدت اور کلاسیکیت کا امتزاج ہے۔ جن کے ہاں داخلیت اور خارجیت یکساں نمایاں ہیں۔ جن کا کلام زمانے کا عکاس اور عہدِ حاضر کا آئینہ دار ہے۔

ایسے ہی ایک شاعر جناب صدیق صائبؔ ہیں کہ جن کا کلام ندرتِ ادا، بلندیٔ خیال، مضمون آفرینی اور موضوعاتی تنوع سے مزین ہے۔ ان کے لہجے کی مٹھاس، الفاظ کا رس، خیال کی چاشنی، شعری حلاوت اور شیریں بیانی انہیں ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جو قدیم و جدید کا سنگم ہے۔

میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ صائبؔ کو تمام شعری مہارتیں اور صلاحیتیں میسر ہیں مگر وہ فنی ریاضت اور مشقِ پیہم کی بھٹی سے اشعار ایسے کندن بنا کر نکالتے ہیں کہ ان میں تہ داری اور اثر آفرینی قاری کو دیر تک اپنے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ نئے شعرا میں اندازِ بیاں، پیرایۂ اظہار اور شعری بنت کاری ہی سب کچھ ہے جبکہ نیا خیال، نیا مضمون اور نئی بات ہمیشہ قاری کو متوجہ کرتی ہے۔

صائبؔ کے بیشتر اشعار میری اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ نئے مضامین کو نئے انداز سے پیش کرنے کا سلیقہ خوب جانتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ بھی چاہوں نہ کھلے رازِ حقیقت اس پر
یہ بھی خواہش کہ اسے ساری خبر ہو جائے

نہ مری خاک پرانی نہ ترا چاک نیا
کوزہ گر آ میں ترے دستِ ہنر کو دیکھوں

غزل ایک ایسی حسیں دیوی ہے جو ہر کسی پر اپنا جوبن آشکار نہیں کرتی۔ اس کے انداز،

اداؤں اور نخروں کا ہر کوئی متحمل نہیں ہوسکتا لیکن وہ شعرا جو اس پر کامل دسترس رکھتے ہیں، یہ ان کی تاحیات کنیز بنی رہتی ہے۔ صدیق صائبؔ نے اپنی خود داری، رعب اور مردانہ وجاہت سے اسے زیر کیا ہوا ہے۔ وہ اپنی انانیت کا علم تھام کر ناقدروں اور بے فیضوں سے نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں تو کبھی بے پروائی کی حدوں کو پار کرتے نظر آتے ہیں۔

عزتِ نفس بھی داؤ پہ لگا بیٹھا ہوں
اس سے بڑھ کر تیری توقیر نہیں ہوسکتی
جب بھی تم چاہو مجھے چھوڑ کے جا سکتے ہو
دوستی پاؤں کی زنجیر نہیں ہوسکتی

صائبؔ کی غزل فکر وفن کے پھوٹتے شگوفوں، نادر تشبیہات اور دلکش استعاروں کا مرقع ہے۔ ان کے اشعار پیوستہ، یکجان اور باہم مربوط ہیں۔ وہ الفاظ کو نپے تلے انداز میں اس طرح شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں کہ قاری کے جذبات اور احساسات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

وہ قافیہ پیمائی اور بھرتی کے مصرعوں سے انحراف کرتے ہوئے معیاری اشعار کہتے ہیں اور کہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں سماجی معاملات ومشاہدات، نازک جذبات وخیالات، دانش وحکمت اور سیاسی نظریات کا وسیع تجربہ جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہر بات کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ جدت اور طرزِ ادائی ایک معنی خیز صورت سامنے آجاتی ہے۔

صدّیق صائبؔ لکھتے ہیں:

ہم تری کلی اطاعت بھی نہیں کر سکتے
ہیں نمک خوار، بغاوت بھی نہیں کر سکتے

میں کہ گرداب میں غرقاب ہوا جاتا ہوں
پھر اٹھا لائی ہے اک لہر کنارے مجھ کو

اب تو زنداں میں رک رک کے ہوا آتی ہے
سخت مشکل ہے تنفس میں روانی رکھنا

وطن اور اجداد سے محبت انسان کے خمیر میں شامل ہوتی ہے۔انسان وطن کے لیے تن من دھن قربان کرسکتا ہے تو اپنے اجداد کی ناموس کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔اجداد پر فخر ایک فطری عمل ہے۔غالب جیسا عظیم شاعر بھی اپنے آبا کے پیشے سپاہ گری پر ہمیشہ فخر کرتا رہا۔اجداد کی عطا کردہ روایات اور نسل در نسل منتقل ہونے والی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر کوئی بھی انسان اخلاقیات کی رفعتیں پالیتا ہے۔

ایک خاندان اور نسلی انسان کی پہچان اس کا اپنے اکابرین سے مضبوط تعلق ہوتا ہے اور ایک ایسی عقیدت سے سرشار ہوتا ہے جو اس کی رگ رگ میں سمائی ہوتی ہے۔

صدیق صائبؔ ایسے خانوادے کے چراغ ہیں جنہیں اجداد کی محبت ورثے میں ملی۔انہوں نے اس محبت کی پاسداری کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔وہ اپنی اس محبت اور عقیدت کو جب شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں تو اس کی صورت کچھ یوں نکھری دکھائی دیتی ہے:

اب مجھے جان بچانی ہے کہ اجداد کی آن
گہے دستار کو دیکھوں ، گہے سر کو دیکھوں

ہم کو اجداد کی قبروں سے حیا آتی ہے
تو سمجھتا ہے کہ ہجرت بھی نہیں کر سکتے

''سرِخواب'' صدیق صائبؔ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔میں نے ان کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے،اس لیے یہ بات کہتے ہوئے مجھے ذرا تامل نہیں ہے کہ میرے یہ الفاظ ان کی شاعرانہ عظمت کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہو سکتے۔

آخر میں بہت سی دعاؤں کے ساتھ ''سرِخواب'' کی اشاعت پر صدیق صائبؔ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا یہ شعری سفر جاری و ساری رہے۔

دعا گو:

علی عمرؔان

ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور

12 اپریل 2021ء

ہم صورت گر کچھ خوابوں کے

(دیباچہ)

زندگی میں جیسے کچھ حقائق سے انکار نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کچھ خواب بھی انسانی فکر و خیال کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔خواب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو ہم نیند کی حالت میں دیکھتے ہیں اور کچھ خواب وہ بھی ہیں جو ہم حالت بیداری میں دیکھا کرتے ہیں جن کی تعبیر کے لیے ہم زندگی بھر دوڑ دھوپ کرتے ہیں لیکن ہر خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا ہر کسی کے نصیب میں کہاں ہوتا ہے۔شاعر بھی زندگی کی منزل کا وہ مسافر ہے جو جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کا عادی ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ اپنے طائر تخیل کی پرواز کے ساتھ کبھی ایسے خواب بھی دیکھ لیتا ہے جو عام افراد نیند کی حالت میں بھی نہیں دیکھا کرتے۔

خواب اگر جاندار ہوں تو وہ انسان کو نہ صرف سرشاری عطا کرتے ہیں بلکہ اس میں تعبیر کے حصول کی تڑپ اور بے قراری بھی پیدا کر دیا کرتے ہیں۔کبھی کچھ خواب کئی حقیقتوں پہ بھاری ہوتے ہیں اور کبھی کچھ حقیقتیں کئی خوابوں کو چکنا چور کر دیا کرتی ہیں۔کچھ آنکھیں خوابوں سے خالی ہوتی ہیں اور کچھ خواب آنکھوں کے محتاج نہیں ہوتے۔جو آنکھیں خواب آشنا نہیں ہوتیں ان پر اشکوں کی حقیقت بھی آشکار نہیں ہوتی۔خوابوں اور اشکوں کا بھی عجیب رشتہ ہے۔کچھ اشک خوابوں کی آبیاری

کرتے ہیں اور کچھ اشک کئی خوابوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ کچھ آنکھیں گنوانے کے لیے نہیں ہوتیں اور کچھ خواب بکھرنے کے لیے نہیں ہوتے۔

''سرِخواب'' ایسی ہی کچھ آنکھوں اور خوابوں کا مرقّع ہے جو شاعری کی صورت میں رونما ہوا ہے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا خواب میری ''ماں'' ہے جسے میں نے حقیقت میں نہیں دیکھا۔ یہ خواب میری زندگی کی کئی حقیقتوں پر حاوی رہا ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک زندگی کے نشیب و فراز میں ماں کی کمی کو میں نے شدت سے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اس کا خمیازہ بھی بھگت چکا ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے کئی حقیقتوں کو اپنے لیے خواب ہوتے دیکھا ہے اور کئی خوابوں کا خون ہوتے دیکھا ہے۔

شعر و شاعری بھی میرے لیے کسی خواب سے کم نہیں تھی۔ کیونکہ میں جس خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتا ہوں وہاں شاعری شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے ماحول میں شعر کہنا کسی بغاوت کے مترادف تھا۔ لیکن میرے خمیر میں جو شعر و ادب کا داعیہ تھا اس کا ادراک مجھے بچپن ہی میں ہو چکا تھا لیکن اس کا اظہار کسی موزوں وقت کا منتظر تھا۔

یہ نوے کی دہائی کے آخری سالوں کی بات ہے جب شاعری کا شوق و شغف ایک شدت سے میرے سینے میں مچلنے لگا تو میں بھی اس فن کی رہبری کے لیے کسی کامل کی تلاش میں ہمہ وقت ایسے ہی سرگرداں رہا کرتا تھا جیسے کسی پیاسے کو پانی کی تلاش ہوا کرتی ہے اور اسی اثنا میں استادِ محترم حکیم خلیق حسین ممتاز صاحب کا میسر آجانا بقول اقبال شعبانی سے کلیمی دو قدم والا معاملہ ثابت ہوا۔ آپ کو خُلقِ حسینی کی خیرات حاصل تھی اس لیے آپ ایک اسم با مسمّٰی شخصیت تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد مجھ میں نہ صرف شعر فہمی کا ملکہ پیدا ہوا بلکہ شعر گوئی کے رموز و معارف سے آگہی بھی نصیب ہوئی۔ انہی کے توسط سے مقامی سطح پر منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کا سلسلہ شروع ہوا اور اپنے شہر کے مختلف شعرا اور ادبی حلقوں سے متعارف ہونے کا موقع میسر آیا۔

سیالکوٹ کے ادبی حلقوں میں ان دنوں نوجوان شاعر شاہد ذکی کا حلقہ بہت نمایاں تھا اور اس

کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس حلقے میں زیادہ تر نوجوان اور نو آموز شعرا شامل تھے۔ میں نے بھی شعر کی وادی میں چونکہ نیا نیا قدم رکھا تھا اس لیے اسی ادبی حلقے سے میرا وابستہ ہونا ایک فطری تقاضا تھا۔ اس حلقے کے روحِ رواں جناب شاہد ذکی جو کہ جدید لب و لہجے کے ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ ایک خوبصورت جذبے و احساس کے حامل انسان بھی ہیں۔ ان کی صحبت سے مجھے اور مجھ ایسے کئی مقامی نوجوانوں کو نہ صرف شعر فہمی کا ادراک حاصل ہوا بلکہ جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ شعر کہنے کا ہنر بھی نصیب ہوا ہے۔

اس حلقے کے دیگر نمایاں شعرا میں شجاع شاذ، رفیق لودھی، تنویر عصری، بلال اسعد، علی زیرک، سرفراز آرش، عتیق ملک، افضل شریف صائم اور ملک الیاس اعوان شامل ہیں۔

یہاں میں ایک نہایت مخلص و مہربان شخصیت جناب اعجاز عزائی کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو حکیم صاحب کے برادرِ اصغر اور ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف استاد محترم کی زندگی میں مجھ سے شفقت و محبت کا سلوک روا رکھا بلکہ ان کی رحلت کے بعد بھی شعر و ادب کے سلسلے میں میری بدستور رہنمائی فرماتے رہتے ہیں۔

میں یہاں پر اپنے والد محترم کا ذکر ضروری اور ناگزیر سمجھتا ہوں جنہوں نے والدہ محترمہ کی وفات کے بعد اپنی تمام تر زندگی ہماری پرورش و نگہداشت پر قربان کر دی۔ والدِ گرامی کے علاوہ میری پرورش و تربیت میں والدہ کی وفات کے بعد سب سے نمایاں اور اہم کردار برادرِ مکرّم جناب قاری محمد حنیف نقشبندی۔ عمِ محتشم جناب علامہ قاری محمد یعقوب قادری اور میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ کا ہے۔ ان تمام شخصیات کا میں جس قدر بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔ ان کے علاوہ میں اپنے دیگر بہنوئی اور بہنوں کا بھی احسان مند ہوں جن کی محبتیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔

اس مقام پر میں تہہ دل سے احسان مند ہوں ان تمام اعزّہ و اقارب یعنی اپنے کزنز (cousins)، بھانجوں، بھتیجوں اور اپنے خاندان اور برادری کے تمام افراد کا جو میرے اشعار محبت سے سنتے ہیں اور میری حوصلہ افزائی بھی فرماتے رہتے ہیں۔

یہاں میں اپنے چند انتہائی مخلص احباب کا ذکر نہ کروں تو سراسر بخل ہوگا جو ہمیشہ میری خیر خواہی فرماتے ہیں بلکہ میری ہر خوشی وغم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور ہمہ وقت میرے دل کے قریب ہوتے ہیں۔یعنی میری مراد پروفیسر ڈاکٹر غلام فاروق نعیمی، پروفیسر عمیر یعقوب، پروفیسر عمر حنیف، علامہ محمد احمد شاہین، علامہ محمد امجد چشتی، علامہ محمد رفیق چشتی، قاری مقصود احمد اور قاری نادر حسین جامی ہیں۔

اس موقع پر میں سنٹر آف ایکسی لینس گورنمنٹ پائیلٹ سیکنڈری سکول کے محترم پرنسپل صاحب، جملہ اساتذۂ کرام اور دیگر رفقائے کار بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جو سکول میں منعقدہ مختلف تقریبات کے موقع پر نہ صرف میرے اشعار کو محبت سے سنتے ہیں بلکہ مجھے داد وتحسین سے بھی نوازتے ہیں۔

میرے اس پہلے شعری مجموعے پر اپنی وقیع اور انتہائی معتبر رائے کا اظہار فرمانے پر میں نامور شاعر جناب افتخار عارف کی خدمت میں ہدیۂ تشکر وامتنان پیش کرتا ہوں جنہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود میری تمنا کا بھرم رکھا اور مجھے اپنی رائے سے نوازا۔ان کے علاوہ جدید لب و لہجے کے خوبصورت شعرا جناب قمر رضا شہزاد، جناب شہزاد نیّر اور جناب حسن عباس رضا کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے میری اس شعری کاوش پر اپنی شاندار اور جاندار آراء سے نوازا۔

میری شاعری اور فنی سفر پر تفصیلی مضمون کی صورت میں روشنی ڈالنے پر میں انتہائی شکر گزار ہوں پیارے بھائی اور جدید نسل کے نمائندہ شاعر ونقاد پروفیسر ضیاء المصطفیٰ ترک صاحب کا جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میری شاعری پر اپنے خیالات وتاثرات کا اظہار یہ لکھنے کے لیے وقت نکالا۔اسی کے ساتھ میں پیارے دوست علی عمران صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی محبت کا اظہار میری شاعری پر اپنے خوبصورت مضمون کے ذریعے کیا۔

میری اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں قدم قدم پر مفید مشوروں اور معلومات سے نوازنے پر میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں شاعرِ بجوات، رفیق من جناب رفیق لودھی صاحب کا جو

میرے لیے ایک خوشگوار ہوا کے جھونکے کی مانند ہیں۔

آخر میں احسان مند ہوں ادارہ ''سلام اردو'' کے روح ورواں، انتہائی انسان دوست اور ادب دوست شخصیت جناب ڈاکٹر شیراز مسعود ہاشمی اور اور اشاعتی ادارے ''اردو سخن پاکستان'' کے مدیر و مہتمم، معروف شاعر اور ادیب جناب ناصر ملک کا جنہوں نے کمال محبت و اخلاص کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت کے مرحلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اجرکم من اللہ!

صدّیق صائبؔ

21 اپریل 2021ء

سیالکوٹ

حمد

ہیں نقش دوامی ترے قرآن کے پارے
مرسل تھے پیامی تری توحید کے سارے

تو نے ہی بشر کو ہیں دیے ہوش و خرد بھی
انساں کی ہدایت کو صحیفے بھی اتارے

مظہر ہیں تری ذات کے یہ ارض و سموات
عکاس ترے حُسن کے خوش رنگ نظارے

منکر ترے بارے میں ہے شبہات میں الجھا
مومن کو تو ہوتے ہیں سرِ عام اشارے

یعقوبؑ کی آنکھوں کو ملے ثوب سے تنویر
یوسفؑ کو تو دربست مکانوں سے گزارے

موسیٰ کو سرِ طور تجلی سے نوازے
بخشے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سرِ عرش نظارے

عیسیٰؑ کے لیے لمس کو تو نے کیا اکسیر
جاری کیے موسیٰؑ کے لیے بارہ فوارے

وہ آتش نمرود کو صائبؔ کرے گلزار
طوفان میں دے نوحؑ کی کشتی کو سہارے

نعت

ترے دیار کا سودا ہے سر میں رکھا ہوا
سلامِ شوق ہے رختِ سفر میں رکھا ہوا

فرشتے دیکھ کے جس کو ادب سے جھکتے تھے
تھا اُن کا نور جبینِ بشر میں رکھا ہوا

گواہی دیتے تھے پتھر عدو کی مٹھی میں
یہ کیسا نطق تھا شجر و حجر میں رکھا ہوا

حضورؐ رحمتِ خالق ہیں خشک و تر کے لیے
ہے اُن کا دستِ کرم بحر و بر میں رکھا ہوا

مری نگاہ میں جچتا نہیں ہے نقش کوئی
ہے عکسِ گنبدِ خضریٰ نظر میں رکھا ہوا

فقط حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی الفت مرا اثاثہ ہے
سوائے اس کے نہیں کچھ بھی گھر میں رکھا ہوا

مرے نصیب میں ہو فقرِ بو ذرؓ و سلماںؓ
میں جانتا ہوں نہیں کچھ بھی زَر میں رکھا ہوا

تری خبر ہو تو بس ایک لمحہ کافی ہے
وگرنہ کچھ نہیں عمرِ خضر میں رکھا ہوا

بلائیں آفتیں مجھ پر ہیں بے اثر صائبؔ
خدا نے مجھ کو ہے ان کے اثر میں رکھا ہوا

سلام

یہی حوالہ ہی سب سے بڑا حوالہ ہے
حسینؑ تجھ کو مرے مصطفےٰؐ نے پالا ہے

ترے لہو سے جو قندیلِ حق ہوئی روشن
اسی سبب سے ہے دنیا میں جو اجالا ہے

تمہارا سجدہء مقتل بچا گیا ہے نماز
ستونِ دین کو تو نے ہی تو سنبھالا ہے

ہٹا کے نقطے کو مجرم سے کر دیا محرم
صفِ یزید سے حُر کو بھی یوں نکالا ہے

میں کس کا ذکر کروں کس کا نام لوں صائبؔ
کہ اس گھرانے کا ہر فرد ہی نرالا ہے

ناؤ اس کی ہے جہاں چاہے اتارے مجھ کو
چھوڑ جائے کسی تنکے کے سہارے مجھ کو

منتظر میں تو ہوں خورشید کا اے ظلمتِ شب
کس لیے کرتا ہے مہتاب اشارے مجھ کو

میں کہ گرداب میں غرقاب ہوا جاتا تھا
پھر اٹھا لائی ہے اک لہر کنارے مجھ کو

میری منزل تری سوچوں سے بہت آگے ہے
راہ دکھلائیں گے کیا تیرے ستارے مجھ کو

میری چاہت پہ ہوس کا جو گماں ہے اس کو
آزمائش سے کسی روز گزارے مجھ کو

جانبِ قریۂ معلوم سفر ہے میرا
کوئی بستی نہ کوئی دشت پکارے مجھ کو

پھر سرابوں پہ سمندر کا گماں ہے صائبؔ
پھر ستاتے ہیں یہ فطرت کے نظارے مجھ کو

اس قدر خوبیٔ تقدیر نہیں ہو سکتی
یہ مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو سکتی

زندگی ملنے میں کچھ دیر بھی ہو سکتی ہے
موت کے آنے میں تاخیر نہیں ہو سکتی

یوں تو ہر کام سنور جاتا ہے تدبیر کے ساتھ
بخت کے کھیل میں تدبیر نہیں ہو سکتی

جب بھی تم چاہو مجھے چھوڑ کے جا سکتے ہو
دوستی پاؤں کی زنجیر نہیں ہو سکتی

تو نے بھیجی ہے جو تصویر وہ تصویر ہی ہے
تو جو خود ہے تری تصویر نہیں ہو سکتی

عزّتِ نفس بھی داؤ پہ لگا بیٹھا ہوں
اس سے بڑھ کر تری توقیر نہیں ہو سکتی

جوش کے ساتھ ہے کچھ ہوش بھی لازم صائبؔ
صرف جذبات سے تقریر نہیں ہو سکتی

نہیں کہ دل میں کوئی آرزو نہیں مرے دوست
مگر یہ سچ کہ تری جستجو نہیں مرے دوست

ہے زخم زخم ہی کارِ جنون کا حاصل
جہانِ عشق میں رسمِ رفو نہیں مرے دوست

بغیر رخت کڑے دشت کا مسافر ہوں
کہ اس سفر میں کوئی آب جو نہیں مرے دوست

مری نماز کسی سہو کے سپرد ہوئی
کہ اقتدا میں کوئی باوضو نہیں مرے دوست

مری زبان پہ جاری ہے تیرا ذکرِ خیر
یہ اور بات ترے روبرو نہیں مرے دوست

میں اس خیال کا پھر کب خیال رکھتا ہوں
وہ جس خیال میں شامل ہی تو نہیں مرے دوست

بہار میں بھی سکوتِ خزاں سلامت ہے
سرِ چمن جو کوئی ہاؤ ہو نہیں مرے دوست

گرتی دیوار کو یا ٹوٹتے دَر کو دیکھوں
کیسے لٹتے ہوئے میں اپنے ہی گھر کو دیکھوں

اب مجھے جان بچانی ہے کہ اجداد کی آن
گہے دستار کو دیکھوں گہے سر کو دیکھوں

نہ مری خاک پرانی نہ ترا چاک نیا
کوزہ گر آ میں ترے دستِ ہنر کو دیکھوں

عین آغازِ محبت ہوئی طاری ہجرت
یار کو دیکھوں کہ میں اپنے نگر کو دیکھوں

ہر نئے موڑ پہ ملنا ہے نیا ساتھ مجھے
ہم سفر دیکھوں کہ میں اپنے سفر کو دیکھوں

ہم تری کلّی اطاعت بھی نہیں کر سکتے
ہیں نمک خوار بغاوت بھی نہیں کر سکتے

غیر مشروط وفاداری کا دم بھرتے ہیں
یعنی ہم تجھ سے شکایت بھی نہیں کر سکتے

ہم کو اجداد کی قبروں سے حیا آتی ہے
تو سمجھتا ہے کہ ہجرت بھی نہیں کر سکتے

لمحہء وصل دوامی ہو یہ ممکن بھی نہیں
اتنی جلدی تجھے رخصت بھی نہیں کر سکتے

ہم پہ طاری ہے کسی شہرِ محبت کا فسوں
ہم تو صحراؤں میں وحشت بھی نہیں کر سکتے

ڈوبتی ناؤ کو اک موج کنارہ دے گی
اک دعا آ کے مصیبت میں سہارا دے گی

وقت رکتی ہوئی سانسوں کا پیامی ہو گا
عمر ڈھلتے ہوئے سورج کا اشارہ دے گی

ایک خورشید اُبھرنا ہے شبِ تار کے بعد
ایک امید ہمیں صبح کا تارا دے گی

ہم تو دیوانے ہیں طوفانوں سے لڑ جاتے ہیں
خلقتِ شہر تو کیا ساتھ ہمارا دے گی

وہ کہ جس زخم کی مانگی تھی اماں دنیا سے
کب یہ سوچا تھا وہی زخم دوبارہ دے گی

موت سے جیتا ہوا زیست سے ہارا ہوا شخص
ہائے وہ شخص وہ حالات کا مارا ہوا شخص

زندگی اس کے خیالوں میں بسر ہوتی ہے
سر سے اترا ہی نہیں دل میں اتارا ہوا شخص

اجنبی آب کی انجان سی لہروں میں کوئی
سرِ گرداب مرے حق میں کنارہ ہوا شخص

دشتِ دنیا وہ تری دھوپ کو کیا جانتا ہے
آتشِ عشق کی بھٹی سے گزارا ہو اشخص

غم کی تاریک مسافت کہ مری تاک میں تھی
منزلِ شب میں وہی صبح کا تارہ ہو اشخص

یہ جو دوری ہے یہ تسخیر بھی ہو سکتی ہے
ملنا چاہو گے تو تدبیر بھی ہو سکتی ہے

آج جو لائقِ تعزیر یہاں ٹھہرے ہیں
کل انہی لوگوں کی توقیر بھی ہو سکتی ہے

اب کے وہ خواب میں آیا تو اسے پوچھوں گا
کیا مرے خواب کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے

آؤ یہ سوچ کے ہم قریہء شب سے گزریں
تیرگی سے پرے تنویر بھی ہو سکتی ہے

کوئی مانگے جو دعا رات کو رو کر صائبؔ
لوحِ محفوظ پہ تحریر بھی ہو سکتی ہے

میں تری ذات سے انکار نہیں کر سکتا
اور تجھے ٹوٹ کے بھی پیار نہیں کر سکتا

وہ عدو مدِ مقابل نہیں آتا میرے
اور میں پُشت سے بھی وار نہیں کر سکتا

عشق وہ کارِ ہمہ وقت ہے جس کے ہوتے
میں جو چاہوں بھی کوئی کار نہیں کر سکتا

دیکھ اے ابرِ بہاراں تو اگر چاہے بھی
مرے اس دشت کو گلزار نہیں کر سکتا

تیرا اس بات پہ اصرار بجا ہے لیکن
اب ترے ساتھ میں تکرار نہیں کر سکتا

سفر کا علم ہے سمتِ سفر نہیں معلوم
سو چل پڑے ہیں مگر، رہ گزر نہیں معلوم

یہ عشق جاں کا زیاں ہے کہ صرف جی کا زیاں
سو ہم سے پوچھ لو تم کو اگر نہیں معلوم

یہ شہر وہ ہے جہاں فرصتِ کلام نہیں
یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں معلوم

ہر ایک آہ مری رائگاں گئی ہے یہاں
کسی دعا میں بھی ہو گا اثر نہیں معلوم

تمہارا باغ ہے ہم تو فقط نگہباں ہیں
ثمر بھی دیں گے یہ سارے شجر نہیں معلوم

ہمارے جیسے بھی صائبؔ فقیر ہوں گے جنہیں
تمہارے دَر کے سوا کوئی دَر نہیں معلوم

کبھی نفرت تو کبھی پیار میں گم رہتا ہوں
زندگی میں ترے اسرار میں گم رہتا ہوں

شہر زادہ ہوں مرادشت سے رشتہ کیسا
میں تو اس کوچہ و بازار میں گم رہتا ہوں

سرِ اظہار انا شور مچاتی ہے بہت
پسِ اقرار میں انکار میں گم رہتا ہوں

دلِ غمناک مجھے تیری خبر یوں بھی نہیں
چشمِ نمناک کے آزار میں گم رہتا ہوں

یہ خموشی تو فقط صبح سے طاری ہے میاں
رات بھر گرمیٔ گفتار میں گم رہتا ہوں

درِ عرفان کھلے گا کبھی مجھ پر صائبؔ
ٹکٹکی باندھ کے دیوار میں گم رہتا ہوں

کمال تھا کوئی اس کی نظر میں رکھا ہوا
وگرنہ کچھ نہ تھا مجھ بے ہنر میں رکھا ہوا

میں اس کی چھاؤں تلے بیٹھ کے کروں بھی تو کیا
مرا ثمر ہی نہ ہو جس شجر میں رکھا ہوا

میں دربدر رہوں میرے لیے ہے نیک شگون
مرا مآلِ سفر ہے سفر میں رکھا ہوا

بس ایک تیری کمی تھی جواب بھی باقی ہے
ترے علاوہ سبھی کچھ تھا گھر میں رکھا ہوا

گیا وہ شخص جو رونق تھا اپنی بستی کی
اب اس کے بعد ہے کیا اس نگر میں رکھا ہوا

اے دل درِ یقیں پہ رسائی کا وقت ہے
گرہِ گماں کی عقدہ کشائی کا وقت ہے

وارفتگی کے ساتھ ملے ہو کچھ اس طرح
یوں لگ رہا ہے جیسے جدائی کا وقت ہے

نکلے بدن سے روح تو خوش ہونا چاہیے
یہ قیدِ زندگی سے رہائی کا وقت ہے

سانسیں رکی رکی سے ہیں جذبات سرد ہیں
اور ٹھہرے پانیوں پہ یہ کائی کا وقت ہے

صائبؔ نہیں یہ منزلِ ادراک کا سفر
دشتِ جنوں میں آبلہ پائی کا وقت ہے

دنیا بہت ہے تیز مرے یار دیکھ کر
چلنا پڑے گا وقت کی رفتار دیکھ کر

اب وجہِ افتخار و شرف ہے جہاں میں زر
جھکتا ہے کون خوبیٔ کردار دیکھ کر

اس نے کیا ہے ترک ارادہ ءِ دشمنی
اک روز میرے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

اے صاحبانِ دشت کرو سب مرا طواف
آیا ہوں آج رونقِ بازار دیکھ کر

مجھ کو فقیہِ شہر کی حکمت کے باب میں
دھوکا ہوا تھا جبّہ و دستار دیکھ کر

ضبط کا امتحاں ضروری ہے
فاصلہ درمیاں ضروری ہے

تیری عادت سی ہوگئی ہے ہمیں
ورنہ تو بھی کہاں ضروری ہے

جیسے مٹی کسی شجر کے لیے
ایک بچے کو ماں ضروری ہے

راستوں کی طلب ہے اپنی جگہ
منزلوں کا نشاں ضروری ہے

جب زمیں ہی رہے نہ پاؤں تلے
سر پہ کب آسماں ضروری ہے

تمہارے بعد رہا ہوں میں کتنا سخت اداس
شکستہ دل کہ ہے سینے میں لخت لخت اداس

ہم ایسے گردشِ دوراں کی زد میں آئے ہیں
ستارہ اپنا پریشاں ہے اور بخت اداس

فضا میں حَبس کا عالم ہے اتنی شدّت پر
گُھٹے ہیں سانس پرندوں کے سب درخت اداس

مسافرت کی تھکن اور مسافتیں بھی کٹھن
رہا ہے ساتھ ہمارے ہمارا رخت اداس

کہاں ہے مملکتِ دل کا حکمراں صائبؔ
اس انتظار میں کب تک رہے گا تخت اداس

اداس روح ہے یوں خاکدان کے اندر
مکین قید ہو جیسے مکان کے اندر

ابد کی راہ میں حائل ہے یہ جہانِ فنا
بھٹک رہا ہوں ابھی اس جہان کے اندر

لگی ہے عمر مجھے یہ اڑان بھرنے میں
فلک پہ پہنچا ہوں میں جس اڑان کے اندر

کلام و نطق پہ ششدر تھے سب فصیح و بلیغ
عجیب سحر تھا اس کی زبان کے اندر

کلیم گزرے گا تشنہ لبوں کے ساتھ کبھی
تھے انتظار میں چشمے چٹان کے اندر

میرے یوسف تری تقدیر سے ڈر لگتا ہے
خواب ایسا ہے کہ تعبیر سے ڈر لگتا ہے

قتل کرنے پہ اتر آئیں نہ حاسد مجھ کو
اپنی بڑھتی ہوئی تشہیر سے ڈر لگتا ہے

یہ بھی ممکن ہے کہ کل دید کو ترسے میری
آج جس کو مری تصویر سے ڈر لگتا ہے

تیرگی جس کے رگ و پے میں سما جاتی ہے
اس کو جگنو کی بھی تنویر سے ڈر لگتا ہے

کوئی مجرم نہیں مجبور ہے جس کو صائبؔ
جرم کرتے ہوئے تعزیر سے ڈر لگتا ہے

کتنا پر پیچ سفر لگتا ہے
مجھ کو ہر موڑ پہ ڈر لگتا ہے

بچ نکلتا ہوں بھنور سے ہر بار
یہ دعاؤں کا اثر لگتا ہے

بند کر لی ہیں جو آنکھیں ماں نے
اب بکھر جائے گا گھر لگتا ہے

دَر بدری ہم سے کیا پوچھتے ہو
اپنا دَر غیر کا دَر لگتا ہے

مجھ کو عادت ہے جو سچ کہنے کی
میرا کٹ جائے گا سر لگتا ہے

کوئی آئے بھی اگر دیپ جلانے والا
میری بستی سے اندھیرا نہیں جانے والا

جس کو میں سارے زمانے سے الگ سمجھا تھا
آج اس کا بھی رویہ ہے زمانے والا

اس کے دل پر بھی کوئی خوف مسلّط ہو گا
کانپتا یوں ہی نہیں تیر چلانے والا

یہ جو اک حبس کا عالم ہے فضاؤں پہ محیط
کوئی طوفاں ہے کسی سمت سے آنے والا

وقت سے پہلے کوئی مر نہیں سکتا صائبؔ
ہے بڑا مارنے والے سے بچانے والا

کسی فن میں مرے مولا مجھے کامل کر دے
کوئی خوبی تو مری ذات میں شامل کر دے

جو ڈبونے کو ہے لے آئی بھنور تک مجھ کو
تو اسی موج کو میرے لیے ساحل کر دے

جو مرے حال سے غافل ہے کئی برسوں سے
یاد سے اس کی کبھی مجھ کو بھی غافل کر دے

میں ستم گر سے معافی کا نہیں ہوں طالب
مجھ کو منظور ہے جو فیصلہ عادل کر دے

مجھ کو درپیش مسافت تو کٹھن ہے صائبؔ
وہ اگر چاہے مرے قدموں میں منزل کر دے

ایسے نکلے ترے گمان سے ہم
گر پڑے جیسے آسمان سے ہم

وقت ہی اپنا جب نہ گزرے گا
کیوں نہ گزریں گے اپنی جان سے ہم

ایک دریا بہا کے گزرے ہیں
ایک صحرا کے درمیان سے ہم

ارض و آفاق رہ گئے تکتے
لامکاں تک گئے مکان سے ہم

خود کو آباد کر رہے تھے مگر
کٹ گئے اپنے خاندان سے ہم

یاد ہم دشت نوردوں کی نشانی رکھنا
آبلے پاؤں میں اور آنکھ میں پانی رکھنا

اب تو زندان میں رک رک کے ہوا آتی ہے
سخت مشکل ہے تنفس میں روانی رکھنا

ہر پڑاؤ پہ ہی منزل کا گماں ہوتا ہے
اپنی فطرت میں سدا نقل مکانی رکھنا

سب کہانی نہیں کردار بھی کچھ دیکھتے ہیں
سامنے سب کے نہ تم اپنی کہانی رکھنا

عشق کے بوجھ کو ہم سر سے اتار آئے ہیں
اپنے بس میں ہی نہیں تھا یہ گرانی رکھنا

غیب سے کوئی اشارہ بھی تو ہو سکتا ہے
یہ جو پتھر ہے ستارہ بھی تو ہو سکتا ہے

جس کے کہنے پہ ہمیں چھوڑ دیا ہے تو نے
کل وہی شخص ہمارا بھی تو ہو سکتا ہے

ایک تنکا جو سرِ آب نظر آتا ہے
ڈوبتے وقت سہارا بھی تو ہو سکتا ہے

تجھ سے پہلے جو مرا حال تھا آنے والے
تیرے جانے پہ دوبارہ بھی تو ہو سکتا ہے

گر بصیرت ہو بصارت کی حقیقت کیا ہے
بند آنکھوں سے نظارہ بھی تو ہو سکتا ہے

یہ جو بے چین کیے رکھتا ہے دل کو صائبؔ
خون کی شکل میں پارہ بھی تو ہو سکتا ہے

ہر ایک درد کا عنوان تو نہیں ہوتا
لہو ہی زخم کی پہچان تو نہیں ہوتا

فراق و وصل کی بے چارگی ہے اپنی جگہ
تری طرح میں پریشان تو نہیں ہوتا

مجھے خبر ہے یہی آخری پڑاؤ ہے
میں دشت دیکھ کے حیران تو نہیں ہوتا

کسی کسی کو میسر ہے یہ فضیلت بھی
ہر آدمی یہاں انسان تو نہیں ہوتا

محبتوں میں تو اخلاص دیکھا جاتا ہے
شمار فائدہ و نقصان تو نہیں ہوتا

تمہارے پاس بھی دنیا میں کیا نہیں دنیا
بس ایک جذبۂ مہر و وفا نہیں دنیا

ترے رویّے پہ نالاں تھے میرؔ و غالبؔ بھی
ترے سلوک پہ ہم ہی خفا نہیں دنیا

ہمارے ساتھ چلیں گے کہاں یہ مہر و ماہ
ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی بچا نہیں دنیا

ہمارے بخت میں لکھی تھی نارسائی ہی
ہماری ہار میں تیری خطا نہیں دنیا

ترا خلوص بھی ہم کو بچا سکے گا کہاں
ہمارے ساتھ کسی کی دعا نہیں دنیا

حرف تنویر میں نہیں آتا
رنگ تحریر میں نہیں آتا

جسم ممکن ہے پر یہ خطۂ دل
تیری جاگیر میں نہیں آتا

جبکہ بنیاد میں محبت ہو
نقص تعمیر میں نہیں آتا

روشنی سے لطیف پیکر ہے
عکس تصویر میں نہیں آتا

ایک لہجہ جو دل بدلتا ہے
بحث و تقریر میں نہیں آتا

خواب اک ایسا ہم نے دیکھا ہے
جو کہ تعبیر میں نہیں آتا

لوگ کیوں ہم سے جدائی کا سبب پوچھتے ہیں
جن کو جانا ہو چلے جاتے ہیں کب پوچھتے ہیں

قریۂ دل پہ اتر آتے ہیں بارش کی طرح
عشق والے بھی کوئی نام و نسب پوچھتے ہیں

عمر بھر لوگ مسیحاؤں کی کب سنتے ہیں
جب چلے جاتے ہیں دنیا سے وہ تب پوچھتے ہیں

ہے کوئی دہر میں اک فرد محمد ﷺ جیسا
مدتوں بعد بھی دنیا سے عرب پوچھتے ہیں

آستاں صدرِ ولایت کا ہے باب حکمت
آؤ اس دَر سے کوئی نکتہ عجب پوچھتے ہیں

نہیں آئینہ کوئی حیرت کو
کوئی صحرا نہیں ہے وحشت کو

دوست سارے ہیں آج بھی مصروف
بھاڑ میں جھونکیے جی فرصت کو

دفعتاً رزق کُھل گیا میرا
ورنہ تیار تھا میں ہجرت کو

ایک خواہش کہ ٹال دی ہم نے
آج روتے ہیں اپنی حسرت کو

اک انا ہی بچا سکے ہم لوگ
اب لیے پھر رہے ہیں عزت کو

خود سے بھی دور ہو گئے صائبؔ
چاہتے ہم نہ تیری قربت کو

گردشت میں جاتے تو پلٹنے کے نہیں تھے
ہم ایسے جنوں خیز سنبھلنے کے نہیں تھے

آنکھیں تھیں کچھ ایسی کہ گنوانے کی نہیں تھیں
کچھ خواب تھے ایسے کہ بکھرنے کے نہیں تھے

اس جور و جفا میں تھا لکھا جاں سے گزرنا
ہم عہدِ وفا سے تو مکرنے کے نہیں تھے

ہم وقت کا احسان اٹھانے سے تھے قاصر
ہم تجھ سے مری جان بچھڑنے کے نہیں تھے

کچھ ان کی توجہ بھی رہی ہم سے گریزاں
کچھ اپنے مقدّر بھی سنورنے کے نہیں تھے

وہ جو ممکن نہیں امکان میں ڈھل سکتا ہے
آدمی وجد سے انسان میں ڈھل سکتا ہے

یہ محبت تجھے سرشار بھی کر سکتی ہے
دل کا غنچہ گلِ ریحان میں ڈھل سکتا ہے

اس پزیرائی سے رسوائی بھی کچھ دور نہیں
فائدہ حُسن کا نقصان میں ڈھل سکتا ہے

ایک بے نام سی ہلکی سی اُمنگ تیرے لیے
یہ تعلّق کسی عنوان میں ڈھل سکتا ہے

ایک احساس بڑے غم سے بچا دیتا ہے
ایک جذبہ کسی طوفان میں ڈھل سکتا ہے

رنج ایسا کہ اٹھایا نہیں جاتا مجھ سے
زخم ایسا کہ دکھایا نہیں جاتا مجھ سے

زندگی ترکِ مراسم پہ بھی آساں نہ ہوئی
اب وہی شخص بھلایا نہیں جاتا مجھ سے

میں کہ تعبیر کی منّت بھی اٹھاؤں کا کہاں
خواب ایسا کہ سنایا نہیں جاتا مجھ سے

میں انا بیچ کے بس پیٹ کا سودا کرلوں
رزق ایسے تو کمایا نہیں جاتا مجھ سے

شدّتِ کرب میں بھی ضبط کی خُو جانتا ہوں
درد ہر اک کو سنایا نہیں جاتا مجھ سے

تیری روداد کو، بنیاد کو ہم جانتے ہیں
شہرِ بیداد ترے ظلم و ستم جانتے ہیں

اور ہوں گے جنہیں ہوتے ہیں مفادات عزیز
ہم تو وہ ہیں جو تعلّق کو اہم جانتے ہیں

تیغ برداروں کو کیا حرف و معانی کا شعور
حرمتِ لفظ تو بس اہلِ قلم جانتے ہیں

منزلیں بھی انہی لوگوں کے قدم چومتی ہیں
جو تری راہ ترا نقشِ قدم جانتے ہیں

اپنے دامن میں میاں غم کے سوا کچھ بھی نہیں
اور جو ہے اسے مالک کا کرم جانتے ہیں

جمالِ دشت جلالِ جنوں سے قائم ہے
یہ حُسن قیس کے حالِ زبوں سے قائم ہے

درونِ آب سبھی نقش خارجی ہیں میاں
ندی کا حُسن مسلسل سکوں سے قائم ہے

شجر سے آخری پتا جو گرنے والا تھا
خزاں کے دور میں کارِ فسوں سے قائم ہے

بگڑ نہ جانے تری سوچ کے بگڑنے سے
وہ ایک ربط جو بس رنگ و خوں سے قائم ہے

ہماری بات میں تاثیر یوں نہیں صائبؔ
ہمارا ربط ہمارے دروں سے قائم ہے

حسرت و مدعا نہیں کوئی
یہ جو لب پر دعا نہیں کوئی

مطمئن ہے وہ یوں بچھڑ کر بھی
جیسے صدمہ ہوا نہیں کوئی

اپنی تقدیر سے شکایت ہے
ہم کو تم سے گلہ نہیں کوئی

ہجر کے بعد اب قیامت کا
خوف مجھ کو رہا نہیں کوئی

بات کردار کی ہے سب صائبؔ
آدمی تو برا نہیں کوئی

جب کبھی اس کے روبرو کی ہے
ہم نے محتاط گفتگو کی ہے

میرے قاتل کو اس کا علم نہیں
کتنی قیمت مرے لہو کی ہے

یہ فقط ظرف ہے ہمارا ہی
ہم نے دشمن کی آبرو کی ہے

آج احباب جو گریزاں ہیں
کوئی سازش مرے عدو کی ہے

جب بھی تنہائیوں نے گھیرا ہے
تیری یادوں سے گفتگو کی ہے

ہم نے کب دشتِ تعصب میں قدم رکھا ہے
تیغ رکھی نہیں ہاتھوں میں قلم رکھا ہے

اپنی اوقات بہر طور دکھائی اس نے
ہم نے جس جس پہ یہاں دستِ کرم رکھا ہے

وہ جو کچھ لمحے ترا ساتھ ملا تھا ہم کو
دل نے اس تشنہ رفاقت کا بھرم رکھا ہے

بار ہا اس کی تو ہم خاک اڑا بیٹھے ہیں
تو نے جس دشت میں اب پہلا قدم رکھا ہے

مصلحت کیش نہ ظالم کے طرف دار ہیں ہم
ہم نے ہاتھوں میں صداقت کا علم رکھا ہے

اب بھی تازہ ہیں مرے ذہن میں یادیں تیری
دل کے شیشے میں سجا کر ترا غم رکھا ہے

دیکھیں جو سرِ خواب نظارہ مری آنکھیں
منظر وہی چاہیں گی دوبارہ مری آنکھیں

اک خواب کی تعبیر کی مہلت مجھے دے دو
چھینو نہ ابھی مجھ سے خدارا مری آنکھیں

اک طفل کا رونا بھی گوارا نہ تھا جن کو
کر لیتی ہیں اب قتل گوارا مری آنکھیں

قسمت میں مری لکھے گئے رت جگے ایسے
اب مانگتی ہیں خواب اُدھارا مری آنکھیں

جس نقش پہ رہتی تھیں جمی میری نگاہیں
کرنے لگیں اب اس سے کنارہ مری آنکھیں

اشکوں کے سمندر میں اُتر آتا ہے اک چاند
دیکھیں جو کسی رات ستارہ مری آنکھیں

جس نے بھی حُسن کا نظارہ کیا
اس نے پھر عشق ہی گوارا کیا

اس کی خالق سے دوستی کیسی
جس نے مخلوق سے کنارہ کیا

ایک درویش کی نصیحت پر
تیرے بارے میں استخارہ کیا

ایک مجذوب کی دعا لے کر
ایک ذرے کو میں ستارہ کیا

آنے والے عذاب کا اس نے
ساری بستی کو تھا اشارہ کیا

مجھ سے مخلص ہے ہم سفر کتنا
ہے مرے ساتھ دَربدر کتنا

ان دنوں سوچ کے سمندر میں
ہے خیالات کا بھنور کتنا

دشمنی میں جو ہے بڑی تاثیر
ہے محبت میں بھی اثر کتنا

تنہا تنہا مسافتیں ہیں مری
دل میں ہے خوفِ رہ گزر کتنا

جس کی رکھتے ہیں ہم خبر ہر پل
ہے وہی ہم سے بے خبر کتنا

اس کی فطرت پہ تبصرہ کیسا
خط لکھے بھی تو مختصر کتنا

چھوڑ آئے ہیں جو تری خاطر
یاد آتا ہے وہ نگر کتنا

ایسا بحران ہے معیشت کا
ہے پریشان ہر بشر کتنا

ہے خوشی کے مقابلے میں غم
ہر زمانے میں معتبر کتنا

ہم بھی ہشیار ٹھہرے اپنی جگہ
وہ بھی چالاک ہے مگر کتنا

اس کو کس کی نظر لگی آخر
آج ویران ہے یہ گھر کتنا

آج اپنے ہی شہر میں صائبؔ
مجھ کو لگنے لگا ہے ڈر کتنا

کوزہ گر مجھ پہ رشک کرتے ہیں
ایسے سانچے میں ڈھل گیا ہوں میں

قافلہ میری گرد میں گم ہے
سب سے آگے نکل گیا ہوں میں

اب تری یاد بھی نہیں آتی
دیکھ کتنا بدل گیا ہوں میں

یہ نیم جاں کہاں اپنی زباں سے بولتا ہے
شدید کرب میں دردِ نہاں سے بولتا ہے

ہماری آنکھ کی باطن تلک رسائی ہے
ہمارا دل ہے جو ہٹ کر جہاں سے بولتا ہے

میں اس کے حُسن کا نقشہ جہاں سے کھینچتا ہوں
ہر ایک شعر کا مصرعہ وہاں سے بولتا ہے

لگا دے ٹھیس جو اک بار دل کے شیشے کو
دوبارہ کون پھر اس بدگماں سے بولتا ہے

بس ایک گھر جو علامت بقائے دین کی ہے
بس ایک سر ہے جو نوکِ سناں سے بولتا ہے

تم جو چلنے کا حوصلہ رکھتے
ہم ترے ساتھ قافلہ رکھتے

کاش ہم بھی ترے تعاقب میں
پیچھے مڑنے کا راستہ رکھتے

خود سے وحشت عجیب تھی ہم کو
روبرو کیسے آئینہ رکھتے

اپنے چاروں طرف اداسی تھی
کیسے خوشیوں سے رابطہ رکھتے

کوئی ہوتا اصول مرنے کا
کچھ تو جینے کا قاعدہ رکھتے

رازداں کوئی تو ملا ہوتا
سامنے دل کا مسئلہ رکھتے

قربتیں گئے دنوں کا قصہ ہیں
دن گزرتے ہیں فاصلہ رکھتے

رنگ میں میرؔ کے غزل ہوتی
شعر غالبؔ سا فلسفہ رکھتے

ہم نہ صائبؔ کوئی پیمبر تھے
سامنے اس کے معجزہ رکھتے

بگولہ یوں خس و خاشاک سے الجھتا ہے
کہ جیسے چاک نئی خاک سے الجھتا ہے

اسی کے حکم سے فیلوں سے لڑ گئے ابابیل
چراغ ظلمت سِفاک سے الجھتا ہے

اب اس کے واسطے موزوں نہیں رہا یہ مقام
کہ تیرا غم دلِ غمناک سے الجھتا ہے

ہوا کے ہاتھ میں آئی ہے گلستاں کی کلید
کہ خار غنچہء نمناک سے الجھتا ہے

ازل سے تا بہ ابد خیر و شر الجھنے ہیں
کہ پاک جثہء ناپاک سے الجھتا ہے

وہ سخت دور ہے دنیا کی بے نیازی کا
کہ بخت گردشِ افلاک سے الجھتا ہے

لگتا ہے آ رہی ہے گھڑی امتحان کی
تیور بدل رہی ہے فضا آسمان کی

بارش کے ساتھ ساتھ ہوائیں بھی تیز ہیں
چھت گر پڑے نہ پھر کہیں کچے مکان کی

برہم مزاج دوست سے بے باک کیا ہوئے
کھلنے لگی ہیں گرہیں سب اپنی زبان کی

غالب ہو جب گمان تو سمجھو یقین ہے
کیونکہ یقیں ہی آخری حد ہے گمان کی

بجلی گری تو اس سے وہی فصل جل گئی
امید تھی لگی ہوئی جس پر کسان کی

صائبؔ خموش رہ کے عدالت کے سامنے
تائید کر رہا تھا وہ میرے بیان کی

تجھ کو ادراک محبت کا اگر ہو جائے
زندگی تیری ستاروں کا سفر ہو جائے

یہ بھی چاہوں نہ کھلے رازِ حقیقت اس پر
یہ بھی خواہش کہ اسے ساری خبر ہو جائے

اس کی مرضی ہو تو گرداب کنارہ ٹھہرے
وہ نہ چاہے تو کنارہ بھی بھنور ہو جائے

اب نہ خواہش کہ ملے کوئی تمہارے جیسا
اب یہ حسرت کہ ترے بعد بسر ہو جائے

تاج پوشی کا کوئی خواب سجائے شب کو
صبح ہوتے ہی وہی شہر بدر ہو جائے

جبکہ اعمال کی تاثیر ہے لازم صائبؔ
کیسے ممکن ہے دعاؤں میں اثر ہو جائے

میں اپنے فن سے ترا ذائقہ بدل لوں گا
اگر یہ ہو نہ سکا مشغلہ بدل لوں گا

کسی بھی شرط پہ منزل نہیں بدلنے کا
زیادہ تو جو کہے راستہ بدل لوں گا

کسی کے دل میں ذرا سا ملال گزرا تو
علَم کو چھوڑ کے میں قافلہ بدل لوں گا

پرانا ربط نئے زاویے سے مت دیکھو
میں اپنی سوچ کا پھر زاویہ بدل لوں گا

یہ اپنے عکس پہ حیرت نہیں گوارا مجھے
یہی رہا تو میں پھر آئنہ بدل لوں گا

دیے کا طاق سے، جو دل کا تیری یاد سے ہے
میں ایک روز یہی سلسلہ بدل لوں گا

مرا اِرادہ تو صائبؔ اٹل حقیقت ہے
یہ تیرا وہم کہ میں حوصلہ بدل لوں گا

آزادی

قفس میں قید ہوں لیکن
مجھے ہر شے میسّر ہے
کوئی خواہش نہیں دل میں
نہ کوئی آس باقی ہے
مگر پھر بھی
قفس کی قید سے باہر
کسی آزاد کو دیکھوں
تو دل ناشاد لگتا ہے
قفس افتاد لگتا ہے
تو دل سے ہوک اٹھتی ہے
قفس برباد ہونا ہے
مجھے آزاد ہونا ہے
مجھے آزاد ہونا ہے

نذرِ اقبالؔ

(تظمین بر شعر خورشید رضوی)

اے مری قوم کو اک خواب دکھانے والے
اے مرے دیس کو امکان بنانے والے
تیرے افکار سے عاری ہے یہاں کا منظر
دست خود دار سے عاری ہے یہاں کا پیکر
ہے جدا دین سیاست سے یہاں کی یکسر
رہبرِ دیں ہے یہاں کذب و ریا کا خوگر
سرحدیں اس کی ہیں پامال نگر ہیں تاریک
منزلیں دور ہوئیں اور سفر ہیں تاریک
سیکڑوں ذہن مگر سوچ ٹھکانے پہ نہیں
سیکڑوں تیر مگر ایک نشانے پہ نہیں
''میں کہ بد بخت ترے دور میں پیدا نہ ہوا
تو وہ خوش بخت کہ تو میرے زمانے میں نہیں''

دہشت گرد

مرے وطن کے حسیں نظاروں کو
کارزاروں میں بدلا جس نے
مرے وطن کے جری جوانو!
اسے وطن سے نکال پھینکو
نہیں ہے اس کا جہاد مقصد
بنامِ دیں ہے فساد مقصد
وہ کل بھی دشمن کا ہمنوا تھا
وہ اب بھی دشمن سے باوفا ہے
مرے وطن کے جری جوانو!
اسے وطن سے نکال پھینکو

بساطِ وقت*

حصارِ وقت سے قیدِ حیات کا رشتہ
عجیب تر ہے مگر جاننا ضروری ہے
حیاتِ خلق کی اک موت سے بھی نسبت ہے
بطورِ صدق اسے ماننا ضروری ہے
قضا کے کھیل میں انساں کا اختیار ہے کیا
پرائی شے ہو اگر اس کا اعتبار ہے کیا
کشش عجیب ہے پھر بھی حیات کے اندر
بشر مگن ہے جو کارِ ثبات کے اندر
کسے خبر ہے کہ کب مہلتِ وصال ملے
نہیں یہ علم کہ کب وقت اپنی چال چلے
کشاکشِ غمِ دوراں میں اس خیال سے ہم

بسا اوقات توجہ جو پھیر لیتے ہیں
بساطِ وقت اسی غفلتِ زمانی میں
ہمارے ہاتھ سے ہر بار چھین لیتی ہے
وہی متاع جسے بڑھ کے ہم نے چاہا ہو
مہک سے پھول سے اور حسنِ زندگانی سے
وہی متاع جسے بڑھ کے ہم نے پایا ہو
ہوا سے آگ سے مٹی سے اور پانی سے

مرے کریم اخی تو بھی تھا ایک ایسی متاع
ترے خلوص پہ صائب کے جان و دل ہوں فدا

* اپنے بھائی کی وفات پر لکھی گئی ایک نظم

---تمت بالخیر---